میں ایک طاقت ور دلیل ہے۔[۲۳]

دراصل آیت شوریٰ کے الفاظ اسی دوسری رائے کی تائید کرتے ہیں، کہ جب معاملے کا تعلق سب سے ہو تو ایک فرد کو محض اپنی صواب دید سے کوئی فیصلہ کر لینے کا اختیار نہیں دیا جاسکتا ہے۔ اگر معاملہ حاکم یا امیر کا ذاتی ہو تب تو یہ سمجھ میں آتا ہے کہ وہ جن لوگوں کو اہل الرائے اور قابل اعتماد سمجھتا ہو ان سے مشورہ لے اور اس کی روشنی میں پوری آزادی کے ساتھ فیصلہ کرے، کیونکہ معاملہ اس کا ذاتی ہے۔ تاہم، اگر معاملہ اس کا ذاتی نہیں بلکہ امت اور اجتماعیت کا ہو، اور ہونے والے فیصلے کا راست اثر امت اور پوری اجتماعیت کے افراد پر ہوتا ہو، تو ایسی صورت میں وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ پر عمل کیا جائے گا، اور امت یا امت کے نمایندوں سے مشورہ لیا جائے گا، اور وہ جس رائے تک پہنچیں گے اسی کو لازمی طور سے اختیار کیا جائے گا۔

شَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ سے تو ایسی کوئی گنجایش نکل سکتی تھی، کہ حکم مشورے میں شریک کرنے کا ہے، مشورے کو مان لینے کا نہیں ہے، لیکن اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ کا تقاضا تو یہی ہے کہ جو بھی فیصلہ ہو وہ شورائی عمل کے ذریعے ہی وجود میں آئے۔ اس میں کہیں بھی کسی ایک فرد کی رائے کو سب کی رائے پر محض اس وجہ سے برتری حاصل نہ ہو کہ وہ کسی امیر کی رائے ہے یا کسی بزرگ کی رائے ہے، کیونکہ آیت میں زور افراد پر نہیں بلکہ معاملے پر ہے، کہ وہ افراد کی باہمی مشاورت سے فیصل ہوتے ہیں۔ اگر افراد مشاورت میں شریک ہوں لیکن معاملات کسی کی ذاتی رائے سے فیصل ہوتے ہوں تو یہ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ نہیں ہے۔

شورائی عمل میں عورت کی شرکت

مشاورتی عمل میں خواتین کی شرکت کے حوالے سے مولانا مودودی کہتے ہیں کہ ایک اسلامی ریاست میں عورتوں کو بھی حقِ رائے دہی حاصل ہوگا۔ اگرچہ نام نہاد متمدن ممالک میں تو عورتوں کو یہ حق بہت بعد میں حاصل ہوا، لیکن اسلام نے تو آغاز ہی میں انھیں یہ حق تفویض کر دیا تھا۔[۲۴]

تاہم، بعض معاصر علما خواتین کی شورائی عمل میں شرکت اور اس کے لیے تشکیل کردہ مجالس شوریٰ کی رکنیت کی بھرپور وکالت کرتے ہیں۔ علامہ علال فاسی: فَاِنْ اَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَ تَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا ط (البقرہ ۲:۲۳۳) سے استدلال کرتے ہوئے

کہتے ہیں کہ جب چھوٹے خاندان کی سطح پر عورت سے خاندانی امور میں مشورے کو مطلوب قرار دیا گیا ہے، تو بڑے خاندان، یعنی امت اور ریاست کی سطح پر آدھے خاندان (خواتین) کو شورائیت کے حق سے کیسے محروم رکھا جاسکتا ہے۔[۲۵]

ڈاکٹر علی صلابی نے خواتین کی شورائی عمل میں شرکت کے حق میں حیاتِ رسولؐ اور خلافت راشدہ کی عملی نظیریں پیش کی ہیں، جن سے خواتین کا ریاست کے امور میں مشورے دینا، اور ان مشوروں کو قابل لحاظ مقام دیا جانا معلوم ہوتا ہے۔ خاص طور سے خلیفہ دوم حضرت عمرؓ کے بارے میں اس کا خاص اہتمام منقول ہے۔[۲۶]

ڈاکٹر علی صلابی نے ایک لطیف استدلال کرتے ہوئے بتایا کہ قرآن مجید میں عورت کا مشورہ کرنا بھی مذکور ہے اور مشورہ دینے کا بھی تذکرہ ہے۔ مشورہ مانگنے کی مثال سورۂ نمل (۲۹-۳۵) میں مذکور ملکۂ سبا کا واقعہ ہے، جس میں ملکہ سبا نے حضرت سلیمانؑ کے پیغام کے تعلق سے اپنے درباریوں سے مشورہ مانگا تھا، جب کہ مشورہ دینے کی مثال سورۂ قصص کی آیت ۲۶ میں مذکور وہ واقعہ ہے جب دو بہنوں میں سے ایک نے اپنے والد کو حضرت موسیٰؑ کی خدمات حاصل کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ قرآن مجید میں مذکورہ دونوں واقعات اس انداز سے بیان کیے گئے ہیں کہ شارع کی رضامندی ظاہر ہوتی ہے۔[۲۷]

البتہ خلافت کا وہ وصف جو مولانا مودودی کے بقول ہر مسلمان کو کارِ جہانبانی میں شریک ٹھیراتا ہے، اس وصف میں مرد اور عورتیں برابر کی شریک ہیں۔ مولانا لکھتے ہیں: ''ایسی سوسائٹی میں ہر عاقل و بالغ مسلمان کو خواہ وہ مرد ہو یا عورت، رائے دہی کا حق حاصل ہونا چاہیے، اس لیے کہ وہ خلافت [vicegerency] کا حامل ہے۔ خدا نے اس خلافت کو کسی خاص معیارِ لیاقت یا کسی معیارِ ثروت سے مشروط نہیں کیا ہے، بلکہ صرف ایمان و عمل صالح سے مشروط کیا ہے۔ لہٰذا رائے دہی میں ہر مسلمان دوسرے مسلمان کے ساتھ مساوی حیثیت رکھتا ہے''۔[۲۸]

عورت کے حق رائے دہی کے سلسلے میں بنیادی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ کی جہاں تعلیم دی ہے، وہاں عورت مرد کی کوئی تفریق نہیں کی ہے، بلکہ جن اوصاف کے درمیان شورائیت کے وصف کا تذکرہ کیا ہے، ان میں سے کوئی بھی وصف مردوں کے ساتھ خاص نہیں ہے۔ پھر خلفاے راشدین میں حضرت عمرؓ کے بارے میں تو صراحت سے ملتا ہے کہ وہ

عورتوں سے مشورہ لیتے تھے اور ان کی رائے قبول بھی کرتے تھے۔[۲۹]

غیر مسلموں کی شورائی اداروں میں شرکت

گو کہ آیت شوریٰ سے اس طرح کی کوئی بات ثابت نہیں کی جاسکتی، کیونکہ آیت شوریٰ میں مسلمانوں کا ذکر ہے، تاہم بعض دوسری دلیلوں کا سہارا لے کر بعض جدید اسلامی مفکرین نے اسلامی ریاست کی مجالس شوریٰ میں غیر مسلموں کی رکنیت کی وکالت کی ہے۔ ڈاکٹر علی صلابی اسی موقف کے حامی ہیں، اور انھوں نے اپنی تائید میں ڈاکٹر یوسف قرضاوی اور ڈاکٹر عبدالکریم زیدان کا حوالہ دیا ہے۔[۳۰]

اقلیتوں کے حوالے سے مولانا مودودی کی رائے ہے کہ: ایک اسلامی ریاست میں غیر مسلموں کے صاحبِ امر بننے کی گنجایش نہیں ہے، بالکل اسی طرح جس طرح ایک اشتراکی ریاست میں منکرین اشتراکیت اور ایک جمہوری ریاست میں مخالفین جمہوریت کے لیے اولی الامر بننے کا نہ عقلاً کوئی موقع ہے اور نہ عملاً۔ مشاورتی عمل میں غیر مسلموں کی شرکت کے حوالے سے وہ وضاحت کرتے ہیں: ''کسی بھی جمہوری ریاست میں سیاسی اقلیت عارضی ہوتی ہے۔ لیکن بعض اقلیتوں کی بعض اقسام مستقل ہوتی ہیں، مثلاً: نسلی، ثقافتی، مذہبی وغیرہ۔ مستقل اقلیت ہونا ایک حقیقی مسئلہ ہے۔ ضروری ہے کہ اس کا کوئی قابلِ اطمینان آئینی حل نکالا جائے تاکہ وہ شہریوں کی حیثیت سے اپنے حقوق سے محروم نہ کیے جائیں۔ اقلیتوں کے منتخب ارکان، پارلیمان کے رکن بن سکتے ہیں، تاکہ وہ اپنے حقوق کا تحفظ کرسکیں''۔[۳۱]

اگر کسی فیصلے کا تعلق براہِ راست غیر مسلموں سے ہو تو ان سے مشورہ لینے کی تائید ائمہ سلف کے یہاں ملتی ہے۔ اس کی مثال ابوعبید نے یہ دی ہے کہ اگر کسی قلعے کا مسلمانوں نے محاصرہ کرلیا، اور قلعے کے سردار صلح کے لیے راضی ہوں تو اس پیش کش پر اس وقت تک عمل نہ کیا جائے جب تک کہ قلعہ کے بقیہ لوگوں کی رائے بھی معتبر ذرائع سے معلوم نہیں ہوجاتی۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز کی یہی ہدایت تھی۔[۳۲]

شورائیت کے باب میں انسانی کوششوں سے استفادہ

شورائیت کے زریں اصول کو بہتر عملی جامہ عطا کرنے کے لیے جہاں یہ ضروری ہے کہ

کتاب وسنت اور امت کے موجود فکری سرمایے سے استفادہ کیا جائے، وہیں عقلِ انسانی کی کاوشوں سے فائدہ اٹھانے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔

شورائیت کا اصول چوں کہ انسان کی فطرت میں ودیعت ہے، اور انسانوں کی بہت ساری دریافتیں وحی و فطرت کے مطابق ہوتی ہیں۔ ریاستی اُمور چلانے کے لیے انسانی کوششوں سے استفادہ کے ذیل میں جمہوری طریقۂ انتخاب اور طرزِ حکومت کا نام سب سے پہلے آتا ہے۔ یاد رہے جمہوریت کا ایک پہلو نظریاتی بھی ہے، جس کا سب سے زیادہ قابل اعتراض حصّہ حاکمیتِ جمہور ہے لیکن کیا یہ ممکن ہے کہ مملکت کا نظریہ اور عقیدہ تو اسلام ہو، قانون سازی کے لیے اصل رہنما اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب قرآنِ کریم ہو، تاہم حکومت بنانے اور چلانے کے لیے بطور نظام وہ طریقے اختیار کیے جائیں، جن کو انسانی ذہن نے ایک طویل سفر اور بے شمار تجربات کے بعد دریافت کیا ہے۔ انسانوں نے اس نظام کو نام جمہوری طرز حکومت کا دیا ہے۔ اس نظام کے بہت سارے پہلو اسلامی تعلیمات سے متصادم بھی ہوسکتے ہیں، لیکن ان میں ترمیم واصلاح کر کے اگر اختیار کیا جائے تو شورائیت کے تقاضوں کے مطابق حکومت چلانے کے لیے وہ نظام موزوں بھی ہوسکتا ہے۔

آمریت زدہ کلچر اور مزاج کے زیر سایہ ماضی قریب کے تلخ تجربات سے گزرنے کے بعد اب اسلامی تحریکات اور علما نے ایسی بہت سی انسانی دریافتوں کی تحسین کی ہے، جو راقم کے نزدیک کسی مرعوبیت کا نتیجہ نہیں بلکہ تلاشِ حکمت کے تحت ہے۔ تاحیات امیر کے تصور کے بجاے اب مختلف اسلامی تنظیموں کے دساتیر میں یہاں تک شامل کیا گیا ہے، کہ امیر کے لیے ایک دورانیہ ہوگا، اور کوئی شخص ان دورانیوں سے زیادہ امارت کے لیے منتخب نہیں کیا جاسکے گا۔

راے شناسی کے لیے راے شماری ضروری ہے

جمہوریت پر تنقید کرتے ہوئے علامہ محمد اقبال کا ایک شعر اکثر ذکر کیا جاتا ہے ؎

جمہوریت اِک طرز حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

اس تنقید کا کیا مطلب ہے، اور علامہ محمد اقبال کے ذہن میں انسانوں کو گننے کے بجاے تولنے کا کیا ممکن طریقہ موجود تھا؟ اس سے قطع نظر، انسانوں کی خواص اور عوام میں تقسیم اور ان کے

درمیان یہ تفریق کہ فلاں کی رائے قابل اعتبار ہو اور فلاں کی نہ ہو، فتنوں کا نیا دروازہ کھولتی ہے۔

دوسری جانب یہ بھی حقیقت ہے کہ جہاں رائے دہی اور رائے شماری کا شفاف اور دیانت دارانہ انتظام ہو، اور جہاں ہر ایک کو سوچنے اور اپنا خیال ظاہر کرنے کی پوری آزادی ہو، وہاں وزنی رائے رکھنے والوں کو اپنی رائے دوسروں تک پہنچانے اور اپنی رائے کا وزن منوانے کا پورا موقع حاصل ہوتا ہے۔ گویا لوگوں کو تولنے کے لیے سازگار ماحول وہیں بنتا ہے جہاں سب کو رائے دینے کا یکساں حق ہو اور جہاں سب کی رائے یکساں طور پر شمار کی جائے۔ سب کی رائے کو رائے شماری کے وقت یکساں وزن دینے سے واقعاتی سطح پر ایسا ہوسکتا ہے کہ کبھی کسی غلط رائے کو اکثریت حاصل ہوجائے، اور وہ محض کثرت رائے کی بنیاد پر مان لی جائے۔ ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ اس طریقے پر عمل پیرا ہونے سے کبھی امت کے بعض مصالح متاثر ہوجائیں، لیکن اس رویے سے احتراز کے نقصانات زیادہ شدید ہوتے ہیں۔

کسی بھی اجتماعی معاملے میں آخری فیصلہ بہرحال رائے شماری کے ذریعے ہو، یہی اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ کی تعلیم ہے، اور یہی احترام انسانیت کا تقاضا ہے۔ اَلْعَوَامُ كَالْاَنْعَامِ ایک خراب اور ناپسندیدہ صورت حال کی تعبیر ہے، جو شہنشاہی نظام کے تحت رہتے رہتے وجود میں آئی ہے۔ یہ کوئی حکیمانہ اصول نہیں ہے کہ جس کی بنا پر کسی نظام کی تشکیل ہو۔ ضرورت اس صورت حال اور اس طرزِ فکر کو بدلنے کی ہے، نہ یہ کہ اس کو قبول کرکے اسے ایک اساس کی حیثیت دے دی جائے۔

نمایندگی شورائیت کے لیے معاون، اس کا بدل نہیں

شورائیت کے اصول کا تقاضا یہ ہے کہ ہر فرد اپنے حاصلِ غور وفکر کو لوگوں تک اور بطورِ خاص فیصلہ ساز اداروں تک پہنچانے کے بھرپور مواقع رکھتا ہو۔ لیکن جہاں صاحبِ معاملہ افراد کی تعداد زیادہ ہو اور سب کو براہِ راست مشورے میں شریک کرنا ممکن نہ ہو، وہاں ضرورت کے تقاضے کے تحت نمایندگی کے اصول کو اختیار کیا جاتا ہے۔ نمایندگی کا مقصد شورائی عمل کو ممکنہ حد تک فعال بنانا ہوتا ہے۔ لیکن بسا اوقات نمایندگی شورائی عمل میں معاون ہونے کے بجاے خود اس راہ کی رکاوٹ بن جاتی ہے۔ نمایندے غوروفکر کے اجارہ دار بن کر پوری قوم کو غوروفکر کے عمل سے محروم کردیتے ہیں۔ ایسے نمایندوں کے غوروفکر کو پوری قوم کے غوروفکر کا بدل سمجھ لینا، اور

نمایندوں کی مشاورت کو وہ حیثیت دے دینا کہ پوری قوم مشاورت کی ذمہ داری سے بالکل کنارہ کش ہوجائے، مثالی رویہ نہیں ہے۔

اگر مشاورت کا مقصد بہتر رائے تک پہنچنا ہے تو اس کے امکانات کم نہیں ہوتے کہ نمایندہ افراد سے زیادہ بہتر رائے تک وہ افراد پہنچ جائیں جو نمایندہ نہیں ہیں۔ ایسے افراد کی رائے کو بے وزن ہونے سے بچانا اور غیر نمایندہ افراد کی قیمتی آرا کو نمایندہ افراد کی رائے کی طرح قانونی اعتبار عطا کرنا، تمدنی سفر کا ایک اہم ہدف ہونا چاہیے۔ نمایندگی کو مستقل اور مثالی حکمتِ عملی کے بجاے وقتی اور عبوری حکمتِ عملی قرار دے کر ایسے نظام کے امکانات پر غور کرنا چاہیے، جہاں ہر فرد براہِ راست مشاورت کے عمل میں حصّہ لے اور جہاں اَمْرُھُمْ شُوْرٰی بَیْنَھُمْ کی ذمہ داری سب ادا کریں اور اس کی برکتوں سے پورا معاشرہ فیض یاب ہوسکے۔

اہل حل وعقد کی اصطلاح؟

فقہ اور اسلامی سیاست کی کتابوں میں 'اہل حل وعقد' کی اصطلاح کثرت سے استعمال ہوتی ہے۔ یہ اصطلاح اسلام کے سیاسی نظام کی ایک اہم بنیاد ہے، اور امت کا مطلوبہ شورائی نظام اہل حل وعقد کے توسط سے چلتا ہے۔ اس اصطلاح پر ڈاکٹر حاکم مطیری کا درج ذیل تبصرہ غور طلب ہے: شوریٰ سب کا حق ہے، اس پر کسی کا بھی خواہ وہ کوئی بھی ہو، دوسروں سے زیادہ حق نہیں بنتا ہے۔

فقہ اور احکام سلطانیہ کی کتابوں میں موجود اہل حل وعقد کی اصطلاح صحابہ کے درمیان معروف نہیں تھی۔ عہد نبوت اور عہد خلافت راشدہ میں مشاورت سب کے لیے عام تھی۔ اہل حل وعقد کی اصطلاح عباسی دور میں ایجاد ہوئی۔ پھر اہل حل وعقد کے سلسلے میں ایسی شرطیں رکھی گئیں جو شاذ ونادر کسی میں پائی جائیں اور جن کے حق میں کوئی دلیل نہیں ہے۔ اس طرح سب کے مشورے سے امیر کے انتخاب کا جو بہت بنیادی حق امت کو دیا گیا تھا، اس حق سے امت کو یہ کہہ کر محروم کردیا گیا کہ ''یہ تو اہل حل وعقد کے دائرہ اختصاص میں آتا ہے''۔ پھر زوال اور کمزوری کے زمانوں میں امت کا حال یہ ہوا کہ خلیفہ اور سلطان ہی اپنی صواب دید اور اپنی پسند کے تحت 'اہل حل وعقد' کا تعین کرنے لگا، اور تعین بھی ان لوگوں کا کیا جاتا جو نہ قوت فیصلہ رکھتے، نہ جرأت اظہار کی دولت رکھتے، البتہ وہ لوگ اس مجلسِ حل وعقد کے رکن بنتے یا بنائے جاتے، جو امت کے لیے بے سود اور

خلیفہ کے لیے بے ضرر ہوتے۔[۳۳]

شورائیت اور انصاف کے تقاضے

بسا اوقات شورائیت کے تقاضوں اور انصاف کے تقاضوں میں باہم تعارض درپیش ہوتا ہے۔ ایسے میں ضروری ہے کہ ایسا نظام لایا جائے جس میں دونوں تقاضوں کو ملحوظ رکھا جائے۔

سقیفہ بنی ساعدہ میں جب اسلامی تاریخ کے پہلے خلیفہ کے انتخاب کا مسئلہ زیر بحث آیا، تو اسلامی امت کے اندر موجود ایک تقسیم ابھر کر سامنے آئی، جو انصار اور مہاجرین کی تھی۔ انصار کی طرف سے مطالبہ آیا کہ: مِنَّا اَمِیْرٌ وَمِنْکُمْ اَمِیْرٌ، ''ایک امیر ہم سے ہو اور ایک تم میں سے ہو''۔[۳۴] اگر اس تقسیم پر وہ اصرار کرتے تو وہ مطالبہ مبنی بر انصاف تھا، لیکن اکابر صحابہؓ نے اس تقسیم کو ذہن سے نکال کر امت کے عمومی تصور کو پیش کیا جس میں ایسی کسی تقسیم سے بالاتر ہونا تھا۔ جس کے بعد سب نے مل کر ایسی شخصیات کی تلاش شروع کی، جن کا انتخاب پوری امت کے مفاد میں ہو۔ یہ امرِ ربی تھا کہ وہ سب شخصیات، یعنی خلفاے راشدینؓ، مہاجرین میں سے تھے، لیکن ان کا انتخاب دونوں گروہوں کی مرضی سے ہوا تھا۔

اگر تقسیم ایسی ہو، جس کو نظر انداز کرنا اور اس سے اوپر اٹھنا ممکن ہو، تو یہی مثالی کیفیت ہے۔ لیکن اگر کسی معاشرے میں موجود کوئی تقسیم ایسی شکل اختیار کرلے کہ اس کو نظر انداز کرنا ممکن نہ ہو، تو جب تک وہ تقسیم ختم نہیں ہوجاتی ہے، اس کو ایک واقعہ مان کر ایسا شورائی نظام تشکیل دیا جائے، جس میں شورائیت کے تقاضوں کے ساتھ معاشرے کے تمام گروہوں کے ساتھ انصاف کے تقاضے بھی ادا ہوسکیں۔

اگر کوئی گروہ مِنَّا اَمِیْرٌ کا مطالبہ رکھتا ہو، تو امارت کے انتخاب کا ایسا نظام ضرور ہونا چاہیے، جس میں ہر ایسے قابل لحاظ گروہ کے مطالبے کی رعایت ہوسکے، اور معاشرے کے کسی گروہ کو محرومی کا احساس نہ رہے۔

ایک اہم مسئلہ

کسی ایک علاقے کے مسلمانوں کے مشورے سے اگر ایک شخص امیر بنتا ہے تو وہ صرف

اس علاقے کے لوگوں کا امیر قرار پائے گا، یا دنیا کے سارے مسلمانوں کے لیے اس کے ہاتھ پر بیعت کرنا ضروری ہوگا؟ یہ ایک اہم مسئلہ ہے جس کی تحقیق ضروری ہے۔ شورائیت کا تقاضا تو یہی لگتا ہے کہ جس علاقے کے لوگ جسے امیر بنادیں وہ اس علاقے کا ہی امیر قرار پائے، لیکن اشکال یہ پیدا ہوتا ہے، کہ کیا بیک وقت عالم اسلام میں متعدد 'خلیفہ' اور 'امیر المومنین' ہوسکتے ہیں؟ خلافتِ راشدہ کے دور میں اس کی مثال نہیں ملتی، بعد کے ادوار میں بعض مثالیں ملتی ہیں، لیکن وہ مثالیں دلیل کا درجہ نہیں رکھتی ہیں۔ یہ مسئلہ حالیہ واقعات کے تناظر میں بہت اہمیت اختیار کرگیا ہے۔ یہ تصور کہ کیا ایک علاقے کے مسلمانوں کا امیر، دوسرے سارے مسلمانوں کو بذریعۂ شمشیر اپنی بیعت پر مجبور کرسکتا ہے، یا کم از کم انھیں دائرہ امت سے خارج سمجھا جائے جو اس کی بیعت سے انکار کردیں، ایک بڑا ہی خطرناک تصور ہے اور شورائیت کے اصول سے براہِ راست متصادم ہے۔

راقم کو احمد ریسونی کی اس بات سے اتفاق ہے کہ: ''اگر 'خلافت' اور 'خلیفہ' کا لفظ مسلمانوں کی زندگی سے ہمیشہ کے لیے روپوش ہوجائے تو ان کے دین میں ذرہ برابر کمی نہیں آئے گی، لیکن اگر محض ایک دن کے لیے عدل روپوش ہوگیا، شورائیت کو دیس نکالا دے دیا گیا اور آئین کی پاس داری کو پامال کردیا گیا، تو یہ سب سے بڑی مصیبت ہوگی''۔

حرفِ آخر

جن اسلامی ملکوں میں غیر شورائی بلکہ آمرانہ نظام عرصۂ دراز سے نافذ ہے، وہاں آمریت کے حق میں سب سے بڑی دلیل یہ دی جاتی ہے، کہ: ''معاشرہ تمدنی لحاظ سے بالغ اور جمہوری طرزِ حکومت کے لیے تیار نہیں ہوا ہے، اور اگر امورِ مملکت عوام کے حوالے کردیے گئے، تو پورا ملک بدترین قسم کے انتشار و اختلاف سے دوچار ہوجائے گا، اور اس کا اندیشہ ہے کہ غلط قسم کے لوگوں کے ہاتھ میں اقتدار آجائے، جو ملک کو تباہی کے راستے پر لے جائیں گے''۔

ڈاکٹر طٰہٰ جابر علوانی کے بقول: ''ان شاطر اور سرکش حکمرانوں نے امت کو یہ باور کرایا ہے، کہ امت نابالغ یتیم بچے کی طرح ہے جسے ایک سرپرست کی ضرورت ہوتی ہے، اور ایسا سرپرست وہ خود ہیں۔ یتیم فرد تو کبھی بالغ بھی ہوجاتا ہے، تاہم یہ امت وہ 'یتیم' ہے جو ہمیشہ 'نابالغ' رہے گی اور ایسے سفاک، لالچی اور خود پسند سرپرست کی ضرورت مند رہے گی۔ یہ غلط اور گمراہ کن پروپیگنڈا

سرکش حکمران ٹولے کے علاوہ ان کے حاشیہ بردار علما اور دانش وَر بھی کرتے ہیں''۔

مولانا مودودی نے اس موضوع پر جمہوریت کے حوالے سے جو گفتگو کی ہے وہ بڑی فکرانگیز ہے۔ مولانا لکھتے ہیں: ''اس سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ جمہوریت میں بھی بہت سے نقائص ہوتے ہیں، اور وہ نقائص بہت زیادہ بڑھ جاتے ہیں، جب کہ کسی ملک کی آبادی میں شعور کی کمی ہو، ذہنی انتشار موجود ہو، اخلاق کمزور ہوں، اور ایسے عناصر کا زور ہو، جو ملک کے مجموعی مفاد کی بہ نسبت اپنے ذاتی، نسلی، صوبائی، اور گروہی مفاد کو عزیز تر رکھتے ہوں۔ لیکن، ان سب حقائق کو تسلیم کر لینے کے بعد بھی یہ عظیم تر حقیقت اپنی جگہ قائم رہتی ہے کہ ایک قوم کی ان کمزوریوں کو دور کرنے اور اسے بحیثیت مجموعی ایک بالغ قوم بنانے کا راستہ جمہوریت ہی ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ ایک انسان اسی وقت اپنے بل بوتے پر زندگی بسر کرنے کے قابل ہوتا ہے، جب کہ اسے اپنے اختیار سے کام کرنے اور اپنی ذمہ داریاں خود سنبھالے کا موقع حاصل ہو۔ آغاز میں اس کے اندر بہت سی کمزوریاں ہوتی ہیں، جن کی بنا پر وہ ٹھوکریں کھاتا ہے، مگر تجربات کی درس گاہ بالآخر اسے سب کچھ سکھا دیتی ہے، اور ٹھوکریں کھا کھا کر ہی وہ کامیابی کی راہ پر آگے بڑھنے کے قابل بنتا ہے۔ ورنہ اگر وہ کسی سرپرست کے سہارے جیتا رہے تو ہمیشہ نابالغ ہی بنا رہتا ہے۔

''ایسا ہی معاملہ ایک قوم کا بھی ہے۔ وہ بھی کبھی نابالغی کی حالت سے نہیں نکل سکتی جب تک کہ اس امر واقعی سے اس کو سابقہ پیش نہ آجائے کہ اب اپنے اچھے بُرے کی وہ خود ذمہ دار ہے، اور اس کے معاملات کا اچھی طرح یا بُری طرح چلنا اس کے اپنے ہی فیصلے پر منحصر ہے۔ آغاز میں وہ ضرور غلطیاں کرے گی، اور ان کا نقصان بھی اٹھائے گی، لیکن صحیح طریقے پر کام کرنے کی صلاحیت پیدا ہونے کا کوئی راستہ ان تجربات کے سوا نہیں ہے۔ علاوہ بریں جمہوری نظام ہی وہ نظام ہے جو ایک ایک شخص میں یہ احساس پیدا کرتا ہے کہ ملک اس کا ہے، ملک کی بھلائی اور برائی اس سے وابستہ ہے، اور اس بھلائی اور برائی کے رُونما ہونے میں ذاتی طور پر اس کے اپنے فیصلے کی صحت یا غلطی کا بھی دخل ہے۔ یہی چیز افراد میں اجتماعی شعور پیدا کرتی ہے۔ اس سے فرداً فرداً لوگوں کے اندر اپنے ملک کے معاملات سے دل چسپی پیدا ہوتی ہے، اور اسی کی بدولت بالآخر یہ ممکن ہوتا ہے کہ ملک کی بھلائی کے لیے کام کرنے اور ملک کو داخلی و خارجی مضمرات سے بچانے میں

پورے ملک کی آبادی اپنی پوری طاقت استعمال کرنے لگے۔ دوسرا جو نظام بھی ہو، خواہ وہ بادشاہی ہو یا ڈکٹیٹرشپ یا اشرافیت، اس میں عوام الناس حالات کے محض تماشائی بن کر رہتے ہیں، اور جب ان حالات کے ردّ و بدل یا بناؤ اور بگاڑ میں ان کی راے اور مرضی کا دخل نہیں ہوتا، تو وہ ان میں دل چسپی بھی لینا چھوڑ دیتے ہیں۔ جمہوریت کے جو اور جیسے بھی نقائص ہوں، انھیں اس نقصانِ عظیم سے بہرحال کوئی نسبت نہیں ہے"۔[۳۵]

حواشی

۲۱-سیّد ابوالاعلیٰ مودودی، اسلامی ریاست، جنوری ۱۹۷۲ء، ص ۳۳۰-۳۳۱

۲۲-سیّد ابوالاعلیٰ مودودی، تفہیم القرآن، ج ۴، ص ۵۱۰

۲۳-علی محمد الصلابی، الشوریٰ فریضۃ اسلامیۃ، ص ۱۱۳، دار ابن کثیر

۲۴-سیّد مودودی، مسلمان خواتین سے اسلام کے مطالبات، ص ۲۲

۲۵-مدخل فی النظریۃ العامۃ للفقہ الاسلامی، ص ۱۰۱، بحوالہ الشوریٰ فریضۃ اسلامیۃ، ص ۱۲۸

۲۶-علی محمد الصلابی، الشوریٰ فریضۃ اسلامیۃ، ص ۱۳۰

۲۷-ایضاً، ص ۱۳۰-۱۳۱

۲۸-اسلامی ریاست، ص ۱۴۳

۲۹-سنن بیہقی کبریٰ، حدیث ۲۰۱۱۹، مکتبہ دار الباز، مکہ مکرمہ

۳۰- الشوریٰ فریضۃ اسلامیۃ، ص ۱۳۵-۱۳۶

۳۱-سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ، Islamic Law and Constitution، (مرتبہ: پروفیسر خورشید احمد)، ۱۹۶۹ء، ص ۲۸۲-۲۸۴

۳۲-کتاب الأموال، ابوعبید قاسم بن سلام، ص ۱۹۱-۱۹۲، دار الفکر، بیروت

۳۳-حاکم المطیری، تحریر الانسان، ص ۳۲۵-۳۲۷

۳۴-بخاری، حدیث ۳۶۶۸، کتاب بدء الوحی، دار الشعب القاہرہ

۳۵-سیّد ابوالاعلیٰ مودودی، ترجمان القرآن، جولائی اگست ۱۹۵۵ء

موسیقی سے قرآن تک

مریم جمیلہ ○

قرآن مجید تک رسائی حاصل کرنے کے لیے مجھے عجیب اور پیچیدہ راستے اختیار کرنے پڑے۔ چونکہ میں منزل پر بڑے احسن طریق سے پہنچی، اس لیے مجھے اپنے تجربات پر کبھی بھی افسوس نہیں ہوا۔

عہدِ طفولیت ہی سے مجھے موسیقی بڑی اچھی لگتی تھی۔ خصوصاً وہ گانے تو مجھے بہت ہی پسند تھے جنھیں دیارِ مغرب میں بلند ثقافت کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ اسکول میں موسیقی میرا پسندیدہ مضمون تھا اور اس میں اکثر مجھے اچھے نمبر حاصل ہوتے تھے۔

جب میں گیارہ سال کی ہوئی تو مجھے ریڈیو پر عربی موسیقی سننے کا اتفاق ہوا۔ یہ مجھے اتنی پسند آئی کہ میں نے اسے پھر سننے کا فیصلہ کرلیا۔ جب بھی میں عربی موسیقی سنتی، مغربی موسیقی کے لیے میرے دل میں کشش باقی نہ رہتی۔ میں نے والدین کو تنگ کرنا شروع کر دیا۔ حتیٰ کہ ایک دن میرے والد مجھے نیو یارک کے شامی علاقے میں لے گئے، جہاں سے میں نے اپنے گراموفون کے لیے بہت سے عربی ریکارڈ خریدے۔ ان میں سے جو سب سے زیادہ مجھے پسند آیا [مصری مغنیہ] وہ اُمِ کلثوم کا وہ ریکارڈ تھا جس میں اس نے سورۂ مریم کی تلاوت کی تھی۔ اس وقت مجھے علم نہیں تھا کہ یہ عورت آیندہ کس بُرے راستے پر گامزن ہونے والی ہے، لیکن مجھے اس کی سُریلی آواز اور عقیدت بڑی پسند آئی۔ انھی ریکارڈوں کی بدولت میں عربی موسیقی کی گرویدہ بن گئی۔ حالاں کہ میں

○ مرحومہ نومسلمہ اور بہت سی قیمتی کتب کی مصنفہ تھیں۔

عربی الفاظ کا مطلب بالکل نہ جانتی تھی۔ عربی موسیقی کی اس بنیادی قدر و منزلت کے بغیر میرے دل میں تلاوت کی محبت پیدا نہیں ہوسکتی تھی۔ حالانکہ یہ ایک مغربی باشندے کے لیے اجنبی تھی۔ میرے والدین، رشتہ دار اور احباب عربی اور عربی موسیقی کو از حد دقیانوسی اور تکلیف دہ سمجھتے تھے۔ اس لیے جب میں ریکارڈ بجانے لگتی تو ان کا ہمیشہ یہی مطالبہ ہوتا کہ میں تمام دروازے اور کھڑکیاں بند کر لوں تاکہ وہ پریشان نہ ہوں۔

۱۹۶۱ء میں قبولِ اسلام کے بعد، نیویارک کی مسجد میں بیٹھ کر جب مشہور و معروف مصری قاری عبدالباسط کی تلاوت کا ٹیپ ریکارڈ سنتی تو مسحور ہو جاتی۔ لیکن ایک نماز جمعہ میں امام صاحب نے ریکارڈ نہ بجایا۔ کیوں کہ اس دن ایک مہمانِ خصوصی آیا ہوا تھا۔ یہ ایک پستہ قامت معمولی لباس میں ملبوس سیاہ فام نوجوان تھا جو زنجبار کا ایک طالب علم تھا۔ جب اس نے سورۂ رحمٰن کی تلاوت شروع کی تو ایسا معلوم ہوا کہ میں نے اس سے پہلے اتنی شان دار تلاوت کبھی نہیں سنی، قاری عبدالباسط بھی اس کے مقابلے میں ہیچ تھا۔ اس سیاہ فام افریقی نوجوان کی آواز نہایت سریلی تھی۔ غالباً حضرت بلال حبشیؓ کی آواز بھی بہت کچھ اس سے ملتی ہوگی!

دس سال کی عمر ہی سے میں نے عربوں کے متعلق وہ ساری کتابیں پڑھ ڈالیں جو مجھے سکول یا اپنے یہودی فرقے کی لائبریریوں سے حاصل ہوسکیں۔ خصوصاً وہ کتب جن میں یہودیوں اور عربوں کے تاریخی تعلقات کا ذکر تھا۔ لیکن قرآن مجید کے متعلق اپنے تجسّس کی تسلی کرنے میں نو سال سے زیادہ عرصہ بیت گیا۔ آہستہ آہستہ جب بلوغت کی عمر کو پہنچی تو مجھے یقین ہوگیا کہ اسلام کو عربوں نے اس بلند مرتبے پر نہیں پہنچایا بلکہ اسلام نے عربوں کو صحرائی بادیہ نشینوں سے دنیا کا حکمران بنا دیا۔ جب تک میرے دل میں اس انقلاب کی وجوہات دریافت کرنے کا شوق پیدا نہ ہوا اس وقت تک قرآن حکیم کا مطالعہ کرنے کا خیال بھی پیدا نہ ہوا۔

۱۹۵۳ء کے موسم گرما میں، کالج میں بہت سے مضامین کا کورس اختیار کر لینے سے میرے دل و دماغ پر سخت دباؤ پڑا۔ اگست میں مَیں علیل ہوگئی اور میں نے سلسلۂ تعلیم منقطع کر دیا۔ ایک شام جب میری والدہ پبلک لائبریری جانے لگیں تو مجھ سے پوچھنے لگیں کہ کوئی کتاب منگواؤ گی۔ میں نے کہا کہ مجھے قرآن مجید کا ایک نسخہ لا دیں۔ ایک گھنٹے بعد جب وہ لوٹیں تو ان کے ہاتھ میں